بیسویں صدی کی باغی مصنفہ

ڈاکٹر شگفتہ حسین*

Abstract:

Whether it is the classical heritage of literature or the contemporary, both have been contributing in lime lighting the deleterious features of the society, rather efforts were of a society which is devoid of all toxics. Commenting on females as creatures of poor or no caliber is quite easy, hence their contributive services to the society cannot be ignored altogether. Nazar-e-Sajjad Haider is one of many female writers who has struggled for the rights of females in a male oriented society. She wrote her first novel in 1911 when she was hardly fifteen or sixteen years old. She wrote many novels, short stories and essays and her manuscripts have the core objective of education for the girls, allowing them for their right to marry of their choice and providing all the rights that are salient features of a civilized society. She may be symbolized as a great feminist of her time. She was lady with a high educational profile, a liberal mind but with a moderate temperament, she was an advocate of the women rights within a certain curriculum of women identity. These were the personalities who voiced their concerns in literature which has effects in their time period. These concerns of violation and promotions of women rights has no end. It is still the need that these concerns may be raised now on a wider horizon, as the malpractices have also taken new turns. Pens are to flow to curb these activities.

کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک تخلیق کار اپنے عہد کا سقراط بن کر اپنے زمانے کے

* صدر نشین شعبہ اُردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان۔

بدصورت رویوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے لیکن اسے وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جس کا وہ حق دار ہوتا ہے میں نے بھی اردو ادب کی ایک ایسی تخلیق کار خاتون کا انتخاب کیا ہے جس کا المیہ یہ ہے کہ اُسے نہ تو اپنے عہد میں اور نہ ہی آنے والے وقتوں میں اپنے عہد کا ضمیر کہا گیا۔ جبکہ اُس نے اپنے معاشرے کی فرسودگی کے خلاف جس انداز سے بغاوت کی وہ انداز تو شاید آج کی کشور ناہید اور فاطمہ حسن نے بھی نہیں اپنایا۔ یوں بھی جن مسائل کے حل کے لیے اُس نے قلم کا سہارا لیا وہ مسائل آج بھی موجود ہیں۔ ادب میں صنفی امتیاز اور ناقدین کے متعصّبانہ رویوں کا شکار یہ مصنفہ نذرِ سجاد حیدر ہے۔

یہ ذِکر ہے ان دنوں کا جب برصغیر پاک و ہند پر صدیوں سے حاکم ہند اسلامی تہذیب کی جگہ ہند یورپی تہذیب نے لے لی تھی اور وہ انگریزی تعلیم جس کی افادیت کا پرچار کرنے پر سرسید احمد خان مطعون ٹھہرے تھے اب عام تھی۔ انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں قائم ہونے والی علمی وثقافتی انجمنوں نے عظیم ذہنی انقلاب برپا کر دیا تھا۔ بنگال سے شروع ہونے والی برہموسماج تحریک کے اثرات صرف بنگال تک محدود نہ رہے تھے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر تعلیم نسواں کی بھی چرچا ہورہی تھی۔ برصغیر پاک و ہند کا تعلیم یافتہ طبقہ حقوقِ نسواں، تعلیمِ نسواں، پردہ، نئی روشنی ،مغربی طرزِ معاشرت، احکام اور شریعتِ اسلام جیسے موضوعات پر عام بحث کر رہا تھا۔ عورتوں تک تعلیم پہنچانے کے لیے انگریزی حکومت بھی پورے خلوص سے کوشاں تھی۔ نصابی کتب، سوشل ناول، لوک قصے، گھریلو استانیاں، گورنس اور رسائل سب مل کر برصغیر کی عورت کو ذہنی بیداری عطا کرنے میں مصروف تھے۔ ادب بھی اس ذہنی انقلاب سے فیض پا رہا تھا۔ ادبی رسائل کی تعداد اور ان میں طبع ہونے والے علمی و ادبی مضامین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ خواتین کے لئے بھی ادبی رسائل جاری ہو رہے تھے۔

خواتین کے لئے پہلا رسالہ ۱۸۸۴ء میں 'رفیقِ نسواں' لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اس کے بعد تو کئی ایک رسائل منظرِ عام پر آئے مثلاً اخبار النساء، تہذیب نسواں، خاتون اور عصمت وغیرہ وغیرہ۔ ان رسائل نے بیداریٔ نسواں میں نمایاں کردار انجام دیا۔ خواتین کے مضامین اور کہانیاں ان رسائل میں شائع ہوتی تھیں لیکن خواتین رواجی پردے کی وجہ سے اپنے نام ظاہر نہیں کرتی تھیں اور والدہ فلاں یا بنتِ فلاں کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ قرۃ العین اپنی والدہ کی پھوپھی اکبری بیگم کا ذکر کرتے بتاتی ہیں کہ انہوں نے اپنا ناول ''گلدستۂ محبت'' مردانہ فرضی نام 'عباس مرتضیٰ' کی حیثیت سے چھپوایا۔(۱)

اس زمانے میں اعلیٰ طبقے کی لڑکیاں گھروں میں یوریشین گورنسوں سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ جانا بھی شروع ہوگئی تھیں، مثلاً عطیہ فیضی اور اُن کی بہنوں نے یورپ سے تعلیم حاصل کی۔ لیکن خواتین کی حالت بدلنے میں تعلیم سے بھی زیادہ جس چیز نے مدد دی وہ قانون سازی تھی۔ مثلاً ستی اور نومولود بچیوں کے قتل کے خلاف قوانین پاس کیے گئے۔ مسلمانوں کے شریعتی مسائل کے حل کے لیے قاضی

ایکٹ پاس کیا گیا تا کہ مسلمان خواتین کو وراثتی حق سے محروم نہ رکھا جائے۔ بچپن کی شادی کے خلاف قانون سازی کی گئی اور بیوہ کو دوسری شادی کی قانونی اجازت بھی دی گئی۔ انگریز سرکار نے خواتین کی تعلیم کے لئے مدارس کے قیام پر بھی توجہ دی۔ ۱۸۶۴ء کے قریب گورنمنٹ آف پنجاب نے خواتین کے مدارس اور نارمل سکول قائم کیے لیکن اس ضمن میں ابتداء میں ہندوستانیوں کی یکسر بے توجہی بلکہ مسلمانوں کے ایک حد تک معاندانہ رویے نے ان کوششوں کو زیادہ مؤثر نہ ہونے دیا۔ (۲)

لیکن حکومتی کوششیں بالکل رائیگاں نہیں گئیں اور رفتہ رفتہ اس اعتبار سے بھی حالات خواتین کے لئے موافق ہوتے گئے۔ عورتوں کے حقوقِ آزادی اور تعلیم ایک ناگزیر ضرورت بن کر ادب کا موضوع بننے لگے۔ مولوی نذیر احمد کی اصغری نے اس دور کے ادب کے نسائی کرداروں کو بہت متاثر کیا۔ یلدرم کی نسرین کی آمد کے بعد بھی خواتین لکھاریوں کے قصہ نما ناولوں کی ہیروئن اصغری کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہتی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وہ اب چار دیواری کے اس تصور کو قبول کرنے کو تیار نہیں جو اصغری نے قبول کیا تھا۔

روشن خیال تعلیم یافتہ میر نذر الباقر کی بیٹی نذرِ زہرا نے اِسی دور میں کم عمری میں ہی لکھنے کا آغاز کیا اور مِس نذر الباقر کے نام سے رسائل میں اپنے مضامین اشاعت کے لیے بھیجنے لگیں۔ ان کی پھوپھی اکبری بیگم نے اپنا پہلا ناول گلدستہءِ محبت، عباس مرتضٰی کے فرضی نام سے تحریر کیا اور ان کا مشہور ناول ''گودڑ کا لال'' ''والدہ افضل علی'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ سترہ برس کی عمر میں نذرِ زہرا کا پہلا ناول 'اختر النساء بیگم' 'بنتِ نذر الباقر' کے نام سے طبع ہوا۔ یہ ناول اگست ۱۹۱۱ء میں نول کشور پریس نے لاہور سے شائع کیا۔ بنتِ نذر الباقر تحریر کرنے کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی تھی کہ معاشرہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ خواتین کسی ادبی سرگرمی کا حصہ بنیں۔ جبکہ ناول کے سرورق پر تحریر تھا کہ ''مولوی سید ممتاز علی صاحب مالک دارالاشاعت پنجاب نے مستورات کے فائدے کے لیے ۱۹۱۱ء نول کشور پریس لاہور میں چھپوایا''۔ مستورات کے فائدے کے لیے لکھے اس ناول میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی مصیبت کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ موضوع وہی ہے جو اُس زمانے کی گھریلو زندگی کے مسائل تھے۔ نذرِ زہرا جو سجاد حیدر یلدرم سے بیاہ کے بعد نذرِ سجاد حیدر کے نام سے معروف ہوئیں، ان کے مضامین تہذیب نسواں کے علاوہ مخزن جیسے معروف رسائل میں بھی شائع ہوتے تھے اور بقول مالک رام ان کا معیار اتنا بلند تھا کہ مصنفہ کی دھوم مچ گئی۔ (۳)

اختر النساء بیگم کے علاوہ ان کے کئی ایک اور ناول بھی شائع ہوئے جن میں آہِ مظلوماں (ستمبر ۱۹۱۱ء) حرماں نصیب (۱۹۲۰ء) جاں باز (۱۹۳۵ء) نجمہ (۱۹۴۲ء) اور مذہب اور عشق شامل ہیں۔ مذہب اور عشق کے بارے میں قرۃ العین کا کہنا ہے کہ یہ ناول کیونکہ ایک ناکام ہندو مسلم رومان پر مبنی تھا اور نذرِ سجاد اس نامور خاندان سے واقف تھیں اس لیے اپنی پھوپھی 'والدہ افضل علی' کے نام سے کتاب لکھی۔ (۴)

عصمت چغتائی اپنے ایک مضمون میں ان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ

''قرۃ العین حیدر کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی اگر نذرِ سجاد کا بھی مطالعہ کیا جائے، جوان کا نجی رشتہ ہے وہی انکا ادبی رشتہ ہے۔ دونوں کا واسطہ ایک ہی طبقہ سے پڑا لہذا دونوں کے مسائل بھی یکساں ہیں۔۔۔۔۔ دکھڑا وہی یعنی ٹھیک ناپ تول شوہر کی نایابی''۔(۵)

عصمت چغتائی کی رائے سے اس حد تک تو اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ دونوں ماں بیٹی نے طبقہ اُمراء یعنی لکھنو کے تعلقہ دار طبقے کو موضوع بنایا ہے لیکن ''ٹھیک ناپ تول شوہر کی نایابی'' قرۃ العین حیدر کا مسئلہ ہو تو ہو نذرِ سجاد کا ہرگز نہیں۔ ان کے مضامین ہوں، افسانے یا ناول وہ انہی مسائل کو موضوع بناتی ہیں جو ان کے زمانے کے ہندوستان کے معاشرتی مسائل تھے مثلاً دوسری شادی، پہلی بیوی کی حق تلفی، بچپن کی شادی، منگنی یا نکاح، پردہ کی پابندی، اولاد کی ناقص تربیت کے نتائج، خواتین کو پسند کی شادی کی اجازت کا نہ ہونا، خواتین کی تعلیم کا نہ ہونا اور ایک صحت مند معاشرے میں خواتین کو آزادی حاصل ہونا۔۔۔۔۔ یہ وہ مسائل تھے جو صرف نذرِ سجاد کی تحریروں کا ہی موضوع نہیں بنے۔ رشیدۃ انساء بیگم، اکبری بیگم، محمدی بیگم اور صغرا ہمایوں مرزا جو اس دور کی نامور تخلیق کار خواتین ہیں وہ بھی کم و بیش انہی مسائل کو پیش کرتی ہیں اور معاشرے کی بگڑی صورت حال کے خلاف نذرِ سجاد کی طرح احتجاج کرتی ہیں۔ آسکر وائلڈ ادب کی تعریف کچھ یوں کرتا ہے کہ

"Literature always anticipates life. It does not copy it but moulds it to its purpose".

اور نذرِ سجاد بھی تخلیقی مبالغے سے کام لیتے ہوئے یہی کرتی ہیں، ان کے ہاں as it should be کی خواہش زوروں پر ہے۔

نذرِ سجاد کی تمام تحریروں کا اگر آپ مطالعہ کریں تو کچھ موضوعات کی تکرار کے ساتھ ساتھ فنی سقم کا بھی احساس ہوتا ہے۔ لیکن انہیں ایسے ہی نظر انداز کرنا پڑتا ہے جیسے مولوی نذیر احمد کے قصہ نما ناولوں کے نقائص کو۔ وجہ اس کی یہ بنتی ہے کہ یہاں مطمع ءنظر کوئی عظیم فن پارہ تخلیق کرنا نہیں بلکہ معاشرے کی تعمیر کرنا ہے۔ معاشرتی مسائل کو مشنری سپرٹ سے حل کرنا ہے۔ نذرِ سجاد اپنے پہلے ناول 'اختر انساء بیگم' کے عرضِ حال میں رقم طراز ہیں کہ ساری معاشرتی خرابیاں

''صرف جہالت کی وجہ سے ہیں۔۔۔۔ لیکن جہالت قصور مستورات کا نہیں یہ ان کی قسمت کے مالکوں بلکہ قوم کی غفلت کا نتیجہ ہے کہ تعلیم نسواں کو اپنے حقیقی فرائض میں شمار نہیں کرتے''۔(۶)

اور اسی ناول کے اختتام کی عبارت یوں ہے

''اگر بہتریِ قوم منظور ہے تو سب سے پہلے جہاں تک ممکن ہو سکے تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیے کہ تمام قوم سنبھل گئی۔۔کبھی آگے نہ بڑھ سکیں گے جب تک کہ اپنی دُنیا میں سب سے پہلی راہنما عورات کو جس کی گود تمام قوم کا ابتدائی سکول ہے چشمۂ علم سے سیراب نہ کریں گے''۔ (۷)

اس ناول کا بنیادی خیال ہی یہ ہے کہ یہ ایک تعلیم یافتہ مصیبت زدہ لڑکی کا قصہ ہے جو تعلیم کی مدد سے اپنی مصیبت کو دور کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ ناول کی ہیروئن پر مولوی نذیر احمد کی اصغری کی چھاپ بہت گہری ہے۔ اس ناول میں دوسری شادی کی قباحت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

نذرِ سجاد کا دوسرا ناول 'آہِ مظلوماں' جو ستمبر ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا اس کا موضوع بھی یہی دوسری شادی ہے۔ دراصل وہ دوسری شادی کے سخت خلاف تھیں چنانچہ جب آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کا چوتھا اجلاس لکھنو میں 1918ء میں منعقد ہوا تو انہوں نے وہاں بیگم شاہنواز کے ساتھ مل کر عورتوں سے دستخط حاصل کئے کہ ''وہ کسی ایسے شخص کو جس کی پہلی بیوی موجود ہو، بیٹی نہ دیں خواہ وہ شخص بادشاہ ہی کیوں نہ ہو''۔ (۸)

اسی ناپسندیدگی کی بناء پر ان کے ناولوں کی ہیروئن یعنی پہلی بیوی ستم زدہ، معصوم اور شریف جبکہ دوسری بیوی انتہائی عیار، خودغرض اور چالاک ہے۔ پہلی بیوی طبقہء امراء سے تعلق رکھتی ہو یا غریب گھر کی بیٹی ہو خاموشی سے ہر ظلم کو سہتی ہے۔ اُف نہیں کرتی احتجاج نہیں کرتی اور آخر کار سرخرو ہوتی ہے۔ یہ ہندوستانی معاشرے کی پتی ورتا خواتین کی بالکل سچی تصویر ہے اور اس وفا کی پُتلی کو نمایاں کرنے کے لیے وہ ظالم ساس اور خودغرض دوسری بیوی کی تصویریں سیاہ رنگ سے بناتی ہیں جبکہ ایثار و قربانی کی مٹی سے گندھی پہلی بیوی کو ہلکے رنگ دیتی ہیں۔

''خواہ تم لوگ ہم پر کتنا ہی ظلم کرو ہماری طرف سے اس کا بدلہ کبھی نہیں ملے گا۔ ہماری جانیں جاتی لیکن وفاداری میں فرق نہ آئے گا''۔ (۹)

''حمیدہ (دوسری بیوی) تم میری جان نکلواؤ گے۔ جب سمجھو گے میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ وہی رہے گی۔ مجھے یہاں اپنی جان گنوانی ہے؟
احسان (شوہر): توبہ توبہ کیسی باتیں کرتی ہو، اب وہ میرے گھر ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتی۔۔۔۔ میں تو کبھی کا الگ کر دیتا۔ اماں جی کہتی تھیں کہ بے نوکر گھر کا کام چل رہا ہے، پڑی رہے، نقصان ہی کیا ہے۔'' (۱۰)

انہیں شکوہ تھا کہ ہندوستان میں اس قسم کی ''ناجائز شادیوں'' کی آندھی چل رہی تھی جس میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی بلکہ یہ طوفان تھا جس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور ان کا ایمان تھا کہ ایک شریف و تعلیم یافتہ بی بی سے بڑھ کر دنیا میں مرد کا کوئی ہمدرد نہیں۔ (۱۱)

انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کا ہندوستان ایک نئے قالب میں ڈھل رہا

تھا۔اس دور کا ادب رجعت پرستی اور فرسودہ رسومات کے خلاف واضح احتجاج ہے۔عورت کا کردار بھی بدل گیا تھا وہ جدید معاشرے کی نئی عورت کا کردار تھا لیکن اس نئی عورت کو ابھی بہت سی زنجیریں توڑ نا تھیں۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادی ایک عام بات تھی اور ہندوؤں کے ساتھ صدیوں کے میل جول سے یہ رواج مسلمان گھرانوں میں بھی موجود تھا۔بچپن کی منگنی اور بچپن کا نکاح نذرِسجاد حیدر کے افسانوں کا محبوب موضوع ہے۔اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:۔

''کئی کئی سال پہلے منگنی اسی لیئے کی جاتی تھی تا کہ کوئی خرابی دیکھی تو رشتہ چھڑا لیا گیا مگر ہوتے ہوتے طرفین کو ایسی پیچ پڑ گئی کہ رسم منگنی بجائے ایک کارآمد چیز ہونے کے پیر کی زنجیر بن گئی''۔(۱۲)

ان کے اکثر افسانوں کی ہیروئن کی بچپن میں منگنی ہو جاتی ہے۔لڑکا کسی دوسرے ملک چلا جاتا ہے۔بچپن کی منگنی اس کے لیے تو کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے لیکن ان کی ہیروئن مشرقی لڑکی اس کے نام پر بیٹھی رہتی ہے۔آخر اس شخص سے اچانک ٹکراتی ہے،اور وہ جو حیاء کی پُتلی ہے اس شخص کے ساتھ وقت گزارنے یا ایک ہی گھر میں رہنے کو بھی عیب نہیں جانتی کہ اس نے اپنے مجازی خدا کو پہچان لیا ہے جبکہ وہ شخص نہ پہچانتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہے۔

''مسٹر کیلاش میرے پتا جی نے ایک بڑی ریاست کا مالک سمجھ کر مجھ کو بیاہ دیا یہ سنا تھا کہ ولی عہد یورپ میں تعلیم پا رہے ہیں۔میرے بچپن ہی میں سب کچھ ہو گیا اب جبکہ ٹکا جی یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تو شادی ٹھہری یعنی گَونا''۔(۱۳)

''امرتسر کے رہنے والے بھی ششدر رہ گئے کہ بڑا با کمال بیرسٹر تھا، وہ غیور لڑکی جو کسی شخص سے بات کرنا بھی گوارہ نہ کرتی تھی ایک اجنبی شخص کے ہاں بے دھڑک دیوانہ وار زمانہء شادی سے پہلے جا قیام گزیں ہوئی۔۔۔۔۔۔۔ ہاں البتہ اسکول میں یہ کوشش ہو رہی تھی کہ اس آزاد منش عورت کو فوراً علیحدہ کر دینا چاہیے۔''(۱۴)

ان ہی پریشانیوں سے بچنے کے لیے ان کی رائے یہ ہے کہ منگنی یوں تو اچھی چیز ہے بشرطیکہ اسے زنجیر نہ سمجھ لیا جائے اور اتنی آزادی بھی روا رکھی جائے کہ شادی سے پہلے کسی طریقے سے ایک دوسرے کو دکھا دیا جائے اور منگنی کی رسم کے بعد دونوں میں خط و کتابت کرا دی جائے۔(۱۵)

خواتین کو ان عذابوں سے نکالنے کے لیے وہ پردہ کی بے جا پابندی کی بھی مخالفت کرتی ہیں۔اس کے لیے وہ ہر حربہ اختیار کرتی ہیں یعنی ناول، افسانہ، مضمون ہر صنف کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتی ہیں جریدہ عصمت میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:۔

''حامیانِ پردہ و مخالفانِ پردہ۔اپنی اپنی کوششیں کر لیں، مگر ہو گا وہی جو زمانہ کرائے گا۔اور یہ سمجھ لیں کہ نہ صرف مسلمانانِ ہند پر بلکہ مسلمانانِ عالم پر جو زبردست اثر

جدید معاشرتِ تُرکی کا پڑے گا اس کے آگے مخالفین تہذیبِ جدید کو ہار ماننی ہوگی۔
۔۔۔عرب عورتیں بھی اس جدوجہد میں مصروف ہیں۔ وہ بھی برقعوں کے غلافوں سے
نِکل کر آزادانہ مردوں کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں گامزن ہونا چاہتی ہیں''۔(۱۶)

اِسی طرح ایک افسانے میں انکا کردار یوں تاسف کا اظہار کرتا ہے کہ

''میں بیوی سے ملتا تھا اور شبہ بھی نہ ہوتا تھا، یہی خرابیاں پردہ داری کی، آٹھ سال سے
عقد اور ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھی تھی، میں نے تصویر تک نہ دیکھی تھی''۔ (۱۷)

ان کے ایک اور افسانے میں تو والد صاحب با قاعدہ تقریر فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں جاہلانہ پردہ میں نہ رہیں گی اور جب وہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے ملیں گی تو ان میں اعتماد آئے گا اور ان کی تعلیم تب ہی مکمل ہوگی کہ سوسائٹیوں سے تعلق پیدا کرایا جائے گا۔ (۱۸)

نذرِ سجاد کی خوش بختی تھی کہ وہ بیاہی بھی گئیں تو سجاد حیدر یلدرم سے جو ترکی کی معاشرت و ترقی سے متاثر ہونے کے سبب خواتین کی آزادی اور تعلیم کے از حد قائل تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بیگم کو ان کی اصلاحی کوششوں پر بُرا بھلا کہا جاتا ہے لیکن وہ بھی پردہ کی شدید پابندی کے خلاف تھے اور اپنی بیوی کی تمام تر سرگرمیوں کو سراہتے تھے۔ (۱۹)

نذرِ سجاد اور ان جیسی دیگر مصلح خواتین کا مطمع ءنظر دراصل معاشرتی اصلاح عموماً اور حقوقِ نسواں کا حصول خصوصاً تھا۔ خواتین اپنی پسند سے اپنے شریکِ حیات کا انتخاب کر سکیں یہ اجازت تو آج کا پاکستانی معاشرہ دینے کو تیار نہیں تو اس دور میں تو شاید یہ خواہش خواب کی باتیں تھیں لیکن اس کے باوجود نذرِ سجاد یہ تقاضا کرتی ہیں کہ شادی دونوں فریقین کی پسند سے ہونی چاہیے۔ (۲۰)

ان کے اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے خیالات ایک سطح پر تو واقعی سماج سدھار خیالات تھے۔ لیکن دوسری سطح پر اس طرح کی تحریریں سر سیّد تحریک کے اثرات اور مغربی استعمار کے غلبے سے لوگوں کے خیالات میں آنے والی تبدیلی کی ترجمان ہیں۔ اس عہد کا سچ یہی ہے کہ ہنداسلامی تہذیب پر طاقت ور ہندیورپی تہذیب غلبہ پا چکی تھی اور مشرقی اقدار و رسوم کو زمانہ جاہلیت کی یادگار قرار دے کر مغربی اقدار کی پسندیدگی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ طاقت ور تہذیب کے افراد سے دوستی، مغربی طرزِ تمدن کو اپنانا سب اس سچ کا حصہ ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں مثلاً ان کے ناولوں اخترانساء بیگم (۱۹۱۱ء) اور حرماں نصیب (۱۹۲۰ء) میں یورپین خواتین ان کے کرداروں کی دوست ہیں اور ستار پر اردو غزلیں بھی گاتی ہیں۔ اِسی طرح ان کے ناول نجمہ (ستمبر۱۹۴۲ء) کی ہیروئن اپنے احباب کے ساتھ کلبوں اور ناچ گھروں میں آتی جاتی ہے۔ لیکن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۲ء تک ان کے خیالات میں ایک تبدیلی رونما ہو چکی تھی وہ پردہ کی پابندی کے تو اب بھی خلاف ہیں لیکن انہیں خواتین کی بے جا آزادی قطعی گوارہ نہیں۔ وہ انگریزی تعلیم کی حمایت کرتی ہیں لیکن مذہبی تعلیم بھی ان کے کرداروں کے لیے ضروری قرار پاتی ہے۔ اس ناول میں انہوں

نے تین بھائیوں کے گھر کا نقشہ کھینچا ہے۔ بڑے بھائی کی بیوی انتہا پسند مسلمان گھرانوں کی جہالت کی تصویر ہے تو تیسرے بھائی کی بیوی یوں مغربی تمدن میں رنگی ہے کہ سلیمان ''سالومن'' ہو گئے ہیں اور صفیہ ''صوفیا'' بن گئی ہے۔ البتہ منجھلی دلہن اعتدال کی راہ چلتے نماز قرآن کی پابند مشرقی روایات سے آگاہ بھی ہے اور انگریزی طرزِ معاشرت بھی اپنائے ہوئے ہے۔ اس ناول کے اختتام پر ایک کردار کی گفتگو ملاحظہ کریں۔

> ''مرحومہ انگریزی بورڈنگ کی تربیت یافتہ تھیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، شائستہ مگر خدا کا خوف ذرا ذرا سے کام میں مذہبی احکام کا جس قدر خیال ہم کم علموں کو رہتا ہے ان کو نہ تھا اور نہ وہ ایسی بے باک فیشن پرست ہو کر اپنے کو تباہ نہ کرتیں۔۔۔۔۔۔ اگر لڑکیوں کو آزادی دی جائے تو یہی نتیجے ہوں گے۔ نجمہ نے اپنی زندگی حد سے زیادہ آزادی کی ہوس میں اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی۔۔۔۔۔۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی مغربی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بے حد ضروری ہے۔''(۲۱)

ان کے ایک اور ناول ''جاں باز'' کا موضوع بھی اس آزادہ روی، نمائش پسندی اور انگریز کی غلامی پر فخر سے اظہارِ ناپسندیدگی ہے۔ نذرِ سجاد جدت پسند، نئے زمانے، نئی تہذیب کی دلدادہ خاتون تھیں، ستار بجاتی، گاڑی چلاتی تھیں۔ غراروں کے نئے ڈیزائن اختراع کرتیں، کھدر کی ساڑھیوں پر نت نئے ڈیزائن چھپواتی تھیں۔(۲۲) لیکن ساری آزاد خیالی اور روشن خیالی کے باوجود بے محابا آزادی انہیں پسند نہ تھی۔ خواتین کا بال روم میں جا کر ڈانس کرنا، ایکٹریس بننا انہیں سخت ناگوار تھا۔ پردے کی مخالفت کرتے ہوئے بھی انہیں یہ احساس رہتا تھا کہ خواتین صرف شمعِ محفل یا صرف تماشبین بن کر نہ رہ جائیں ان سے کام بھی لینا چاہیے۔(۲۳)

جہیز اور شادی بیاہ پر اصراف تو آج بھی ہوتا ہے لیکن کئی ایک ایسی عجیب و غریب رسمیں تھیں جو نذرِ سجاد کے دور کی مسلم اشرافیہ نے اپنائی ہوئی تھیں۔ ان کے ناولوں میں ان قبیح رسموں کا ذکر بھی ہے اور ناگواری کا اظہار بھی۔ ''لڑکی کی شادی کرتی ہے تو یہی چاہتی ہے کہ تمام دنیا کی رسومات ختم کر دوں۔ کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔ بٹنا، کنگنا، صحنک اور رتجگہ، منڈھا اور ساچق غرض کہ سب ہی فرض ادا ہوں۔''(۲۴)

ان کا کہنا یہی تھا کہ یہی رسومات ہیں جنہوں نے ہماری قوم کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔ اور یہ رسومات مالی نقصان کے ساتھ ہمیں مشرک و ناشائستہ بناتی ہیں۔(۲۵) اختر النساء بیگم (ناول) میں ایک تعلیم یافتہ گھرانا اپنی بیٹی کی بارات کی تواضع چائے اور کیک سے کرتا ہے۔

۱۸۸۰ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کے معاملات شریعت نمٹانے کیلئے عدالتوں میں قاضی متعین کئے تھے، لیکن ان قاضیوں نے ہندوستانی معاشرے میں رائج قوانین کی پیروی کرتے ہوئے عورتوں کو نہ تو جائیداد میں حصہ دینے کیلئے کوئی قانون پاس کیا اور نہ ہی انہیں مرد کو طلاق دینے کی اجازت دی اور نہ خلع حاصل کرنے کا حق دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ خواتین کے معاملے میں شریعت کا یوں خوں ہوتے دیکھ کر مرد تو پھر بھی بول اُٹھے۔(۲۶) لیکن

خواتین کے حقوق کی ایسی زبردست حامی نذرِ سجاد کے یہاں ایسی کوئی تحریر نہیں ملتی یا کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ان کے کسی ناول میں عورت کو جائیداد سے حصہ دینے،عورت کی گواہی کیلئے دوعورتوں کی شرط کے ہونے، دیت کے قانون یا خلع لینے کی اجازت ہونے یا اسلامی شریعی قوانین کے عین مطابق مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہونے کے بارے میں کوئی تحریر تو کیا ذکر تک نہیں ملتا ہے۔یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مولویوں یا علماء کے فتووں سے ڈر گئی ہوں گی کیونکہ ان کی مخالفت میں مذہبی رہنماؤں کی تقریریں اور بیانات تو آتے رہتے تھے۔معلوم نہیں یہ موضوعات ان سے کیوں چوک گئے۔

بہر حال اس تشنگی کے باوجود اگر میں انہیں اپنے دور کی 'کیرن ہورن آئی' کہوں تو مبالغہ نہ جانیئے۔عجیب مماثلت ہے دونوں میں کہ کیرن ہورن آئی اور نذرِ سجاد حیدر کا عہد ایک ہی ہے۔کیرن ہورن آئی جرمنی میں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئیں اور نذرِ سجاد ہندوستان میں ۱۸۹۴ء میں۔نذرِ سجاد نے ہندوستان کے مردوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا،مذہبی علماء سے ٹکر لی اور حقوقِ نسواں اور سماج سدھار کیلئے جوان سے بن پڑا بڑی جرأت مندی سے کیا۔اور کیرن ہورن آئی نے علم نفسیات کی دنیا میں فرائیڈین تھیوریز کو رد کرتے ہوئے اپنا نظریہ دیا کہ شخصی خصوصیات Biological factors سے نہیں ثقافتی و معاشرتی عوامل سے تشکیل پاتی ہیں۔ بقول Hergenhahn:

> "She enabled up disagreeing with almost every conclusion that Freud had reached about women. At that time disagreeing with Freud took considerable courage....... Chodorow (1989) recognizes Horney as the first psychoanalytic feminist".(۲۷)

نذرِ سجاد کو ہم اپنے عہد کی ہورن آئی نہ کہیں تو نہ سہی لیکن بہر حال ہمیں اُن کی ایسی حق تلفی بھی نہیں کرنا چاہیے کہ چند جملوں میں انہیں نمٹا دیں اُنہیں اُن کا صحیح مقام دینے کے لیے ان کو مکمل دریافت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ بلاشبہ اُردو ادب کی پہلی feminist ادیبہ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ قرۃ العین حیدر،''کارِ جہاں دراز ہے''(ناول)،س۔ن،لاہور،مکتبہ اردو ادب،ص۱۶۲۔

۲۔ نادرہ زیدی،''عورتوں کا ادب''(مضمون)،مشمولہ،''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' نویں جلد،۱۹۷۲ء، لاہور،پنجاب یونیورسٹی،ص۲۷۳۔

۳۔ مالک رام،''تذکرہ معاصرین''،۱۹۷۲ء،دہلی،پبلشنگ ہاؤس ص ۳۶

۴۔ قرۃ العین حیدر، ''کارِ جہاں دراز ہے'' (ناول)، ص ۳۱۴۔
۵۔ عصمت چغتائی، ''پوم پوم ڈارلنگ'' (مضمون) مشمولہ نقوش، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ص ۸۷۔
۶۔ بنتِ نذرالباقر ''اختر النساء بیگم'' (ناول) ۱۹۱۱ء، لاہور، نول کشور پریس، ص ۳۔
۷۔ بنتِ نذرالباقر ''اختر النساء بیگم'' ص ۲۸۸۔
۸۔ قرۃ العین حیدر ''کارِ جہاں دراز ہے'' ص ۲۳۸۔
۹۔ نذرِ سجاد حیدر '' آہ مظلوماں'' (ناول) ۱۹۲۳ء لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ص ۲۵۔
۱۰۔ نذرِ سجاد حیدر ''دکھ بھری کہانی'' (ناولٹ) ۱۹۳۵ء لاہور، دارالاشاعت پنجاب، ص ۱۱۔
۱۱۔ نذرِ سجاد حیدر '' آہ مظلوماں'' ص ۱۰۳۔
۱۲۔ نذرِ سجاد حیدر ''رسمِ منگنی'' (مضمون) مشمولہ عصمت ماہنامہ، مئی ۱۹۲۷ء، جلد ۳۸، شمارہ ۵، ص ۳۲۹۔
۱۳۔ نذرِ سجاد حیدر ''مالی کی بیٹی'' (افسانہ) مشمولہ عصمت ماہنامہ، دہلی، اپریل ۱۹۴۵ء، جلد نمبر ۴۷، شمارہ ۴، ص ۲۲۲۔
۱۴۔ نذرِ سجاد حیدر ''نیرنگئ تقدیر'' (افسانہ) سلسلہ سرتاج نمبر ا، ۱۹۲۵ء، ملتان، دارالاشاعت سرتاج، ص ۲۳۔
۱۵۔ نذرِ سجاد حیدر ''رسمِ منگنی'' (مضمون) مشمولہ عصمت، مئی ۱۹۲۷ء، ص ۳۲۹۔
۱۶۔ نذرِ سجاد حیدر ''ایک تجویز'' (مضمون) مشمولہ عصمت، اپریل ۱۹۲۸ء، جلد ۴۰، شمارہ ۴، ص ۲۹۹۔
۱۷۔ نذرِ سجاد حیدر ''حق بحقدار'' (افسانہ) مشمولہ نیرنگِ خیال، سالنامہ ۱۹۳۵ء جلد ۲۰، نمبر ۱۲، ص ۱۸۳۔
۱۸۔ نذرِ سجاد حیدر ''نیرنگِ زمانہ'' (افسانہ) مشمولہ عصمت، مارچ ۱۹۲۸ء جلد ۴۰، شمارہ ۳، ص ۲۱۶۔
۱۹۔ نذرِ سجاد حیدر ''ایامِ گذشتہ'' (ڈائری) مشمولہ عصمت، مارچ ۱۹۵۸ء جلد ۱۰۰، شمارہ ۳، ص ۱۱۹۔
۲۰۔ نذرِ سجاد حیدر ''نیرنگِ زمانہ'' (افسانہ) مشمولہ عصمت، مارچ ۱۹۲۸ء، ص ۲۲۰۔
۲۱۔ نذرِ سجاد حیدر ''نجمہ'' (ناول) ستمبر ۱۹۴۲ء، کراچی، عصمت بک ڈپو، ص ۲۴۴، ۲۴۵۔
۲۲۔ قرۃ العین حیدر ''کارِ جہاں دراز ہے'' (ناول) ص ۴۲۸۔
۲۳۔ نذرِ سجاد حیدر ''ایامِ گزشتہ'' (ڈائری) مشمولہ عصمت، مارچ ۱۹۵۸ء، ص ۱۱۸۔
۲۴۔ نذرِ سجاد حیدر ''اختر النساء بیگم''، (ناول) ص ۹۹۔
۲۵۔ نذرِ سجاد حیدر ''اختر النساء بیگم''، (ناول) ص ۹۳۔
۲۶۔ علامہ راشد الخیری، ''شرع کا خون'' (افسانہ) مشمولہ ''حور اور انسان'' (افسانوی مجموعہ) ۱۹۳۶ء، دہلی، عصمت بک ڈپو، ص ۳۲۔
۲۷۔ B.R. Hergenhahn "An Introduction to the History of Psychology" 2005, Fifth Edition, Canada, Wadsworth, P.519.